سید سلیمان ندوی

مولانا سید سلیمان ندوی صوبہ بہار ضلع پٹنہ (عظیم آباد) موضع دیسنہ کے ایک علمی خاندان میں جمعہ کے روز ۲۲ نومبر ۱۸۸۴ء مطابق ۲۳ صفر ۱۳۰۲ھ کو پیدا ہوئے۔ ان کے جد امجد جناب حکیم محمدی صاحب نے ان کا نام ابو نجیب انیس الحسن رکھا اور بچپن میں آپ اسی نام سے پکارے جاتے تھے۔ لیکن ان کے دادا ہی نے اسے بدل کر سید سلیمان رکھ دیا۔ ان کا خاندان شہاب الدین غوری کے ساتھ ہندوستان آیا۔ پھر ہندوستان کے مختلف علاقوں سے ہوتا ہوا مظفر نگر پہنچا اور یہاں سے آخری دورِ مغلیہ میں صوبہ بہار آیا۔ اس صوبے میں جو آپ کے مورثِ اعلیٰ آئے وہ چاند تھے[1] سید صاحب ننہال کی طرف سے زیدی اور ددھیال کی طرف سے حسینی سید تھے۔ مرتب قاموس المشاہیر نظامی بدایونی مرحوم فرماتے ہیں کہ آپ نسباً رضوی سادات ہیں[2]۔ مولانا ابو ظفر صاحب ندوی نے اپنے مقالہ "بچپن اور طالب علمی کے کچھ واقعات" مطبوعہ معارف [illegible] مئی ۱۹۵۵ء میں لکھا ہے کہ سید صاحب کا پدری سلسلہ نسب امام موسیٰ رضا تک پہنچتا ہے اور مادری امام زید تک۔

دیسنہ ایک مردم خیز خطہ اور علم و فضل کا گہوارہ رہا ہے۔ اس میں بڑے بڑے علماء فضلاء اور صوفیا نے جنم لیا۔ سید صاحب کے گھرانے کو طبابت اور تصوف سے گہرا شغف تھا۔ آپ کے والد بزرگوار مولانا حکیم سید ابو الحسن صاحب ریاست اسلام پورہ کے طبیب [illegible] مولانا غلام محمد صاحب اپنے مقالہ "سیرت سلیمانی کا عرفانی پہلو" میں فرماتے ہیں کہ آپ کے والد ماجد ایک عالم اور طبیب حاذق، نقشبندی ابوالعلائی سلسلے کے شیخ اور صاحب نسبت [illegible]

---

[1] تذکرہ شعرائے بہار جلد ۲ ص ۱۳۹

[2] قاموس المشاہیر جلد ۱ ص ۲۱۷

تھے۔ مولانا سید سلیمان کے بڑے بھائی حکیم ابو حبیب صاحب عمر میں آپ سے بائیس ۲۲ سال بڑے تھے، اور آپ کو پیار سے "سلو" کہا کرتے تھے[۳] مولانا غلام محمد صاحب نے مقالہ محولہ بالا میں انھیں بارہ سال بڑا لکھا ہے، اور یہ بھی لکھا ہے کہ آپ (حکیم ابو حبیب صاحب) دسنہ کے مشہور طبیب جید عالم اور حضرت شاہ ابو احمد صاحب بھوپالی مجددی کے خلیفہ مجاز تھے۔ آپ (سید صاحب) کے چچا حافظ تجمل حسین صاحب ایک صاحب حال بزرگ اور شاہ فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی کے خلیفہ تھے۔ سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب فرماتے ہیں کہ ان کے دادا مولوی محمد شیر صاحب المعروف بہ حکیم میر محمدی اپنے زمانے کے مشہور طبیب تھے اور صاحب دل صوفی بھی۔ ان کی ایک کتاب "نور محمدیہ"[۴] معارف پریس اعظم گڑھ میں چھپی ہے، جس میں سہروردیہ اور قادریہ سلسلے کے بزرگوں کے حالات ہیں۔ فن طب پر بھی انھوں نے دو کتابیں "قرابادین محمدی" اور "مخزن الحکمۃ العلیا"[۵] لکھی ہیں۔ غلام محمد صاحب مزید فرماتے ہیں کہ آپ کے والد ماجد نے آپ کی اخلاقی تعلیم کو ہمیشہ مدنظر رکھا۔ پھر آپ (سید صاحب) کے بڑے بھائی ابو حبیب صاحب نے پوری توجہ فرمائی۔ خود سید صاحب فرماتے تھے کہ لڑکپن میں میں نے اپنے بڑے بھائی کے حسب ہدایت کچھ ذکر اور مراقبات بھی کیے، اور ان کے حلقۂ توجہ میں بیٹھا کرتا تھا، اور ان کے فیض سے اپنے اندر پاکی محسوس کرتا تھا[۶]

مکتبی تعلیم اپنے گاؤں کے معلم خلیفہ انور علی اور پھر مولوی مقصود علی سے پائی۔ اردو فارسی کی ابتدائی کتابیں ختم کرنے کے بعد عربی میں میزان و منشعب اپنے بڑے بھائی مولوی ابو حبیب صاحب سے پڑھی۔ مزید تعلیم کے لیے اپنے والد بزرگوار کے پاس اسلام پور آ گئے۔ وہاں سے ۱۸۹۹ء میں پھلواری شریف (پٹنہ) آئے۔ یہاں ایک سال مجھی میں رہ کر مولانا محی الدین سجادہ نشین پھلواری شریف سے منطق کے ابتدائی دو چار سبق پڑھے۔ پھلواری شریف سے مدرسہ امدادیہ دربھنگہ شریف آ گئے۔ یہاں چند ماہ رہے[۷]

---

۳ حفیظ الحق دسنوی : جنگ کراچی مورخہ ۳ دسمبر ۱۹۸۳

۴ سید صباح الدین عبد الرحمٰن۔ معارف سلیمان نمبر اعظم گڑھ ص ۱ ۵ ایضاً

۶ غلام محمد صاحب۔ معارف مئی ۱۹۵۵، اعظم گڑھ، ص ۲۸۵

۷ "معارف" اعظم گڑھ سلیمان نمبر، ص ۲

۱۹۰۱ء میں ندوۃ العلما لکھنؤ میں داخل ہوئے۔ اس زمانے میں ندوہ کے صدر مدرس مولانا فاروق چڑیاکوٹی تھے جو ادب اور معقولات کے امام تھے۔ صرف و نحو، منطق و فلسفہ، ادب و عروض کے بے مثل استاد تھے۔ سید صاحب مولانا فاروق چڑیاکوٹی کی طرزِ تعلیم کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "موصوف کے طرزِ تعلیم نے چند ہی دنوں میں یہ کیفیت پیدا کردی کہ آنکھوں سے پردے ہٹ گئے اور وہ مسئلے جو پہلے استادوں کے سمجھانے سے سمجھ میں نہیں آئے تھے وہ روز روشن کی طرح نظر آنے لگے"[۸] وہ جو پڑھاتے عملی طور پر پڑھاتے اور اس کی مشق کراتے۔ وہ کتاب نہیں پڑھاتے تھے بلکہ فن کے مسائل پڑھاتے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ طالب علم فن پر قابو پالیتا۔ سید صاحب فرماتے ہیں کہ ان کے طرزِ تعلیم کی بہتری کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ مولانا شبلی جیسا کامل ان کی درس گاہ سے پیدا ہوا۔[۹] ابتدائی چند سال سید صاحب کو موصوف سے تلمذ رہا۔ ۱۹۰۵ء میں علامہ شبلی نعمانی طویل عرصہ سرسید کی معیت میں گزار کر ندوہ آگئے۔ اب سونا کسوٹی چڑھا، سید صاحب کو اپنی علمی زندگی میں اصلی راہ نمائی علامہ شبلی نعمانی ہی سے حاصل ہوئی۔ اس دوران علمِ حدیث کا درس مولانا حفیظ اللہ صاحب سے لیا۔[۱۰] اور فقہ کا درس مفتی عبداللطیف صاحب سے لیا۔[۱۱] ۱۹۰۷ء میں ندوہ سے فارغ التحصیل ہوئے۔

ندوہ سے فراغت کے بعد سید صاحب کو بڑے کرب سے گزرنا پڑا۔ علامہ شبلی کے والد بزرگ وار کی طرح سید صاحب کے والد محترم بھی موصوف کی مزید علمی و ادبی سرگرمیوں کے خلاف تھے۔ سید صاحب کے والد گرامی، برادر بزرگ وار اور خسر محترم سید ابو یوسف صاحب کی خواہش تھی کہ سید صاحب خاندانی پیشہ طب کی تعلیم حاصل کریں۔ لیکن سید صاحب کا ادھر بالکل رجحان نہ تھا۔ علامہ شبلی اپنے شاگردِ خاص کے زبردست موید تھے۔ علامہ شبلی نے ابو یوسف صاحب کو خط لکھا، اور جب پٹنہ تشریف لے گئے تو ان سے کہا کہ سید صاحب کے والد سے کہہ دو کہ سید سلیمان کو ہمیں دے دیں۔ استاد کی بے پایاں شفقت دیکھ کر سید صاحب کے والد محترم خاموش ہوگئے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کو اس کا بہت قلق تھا کہ خاندانی پیشہ طبابت کے ساتھ تصوف کی خاندانی روایت بھی گئی۔

---

۸ مولانا سید سلیمان ندوی۔ نقوش آپ بیتی نمبر ۹ ایضاً

۱۰ سید صباح الدین عبدالرحمٰن۔ معارف اعظم گڑھ۔ مئی ۱۹۵۵ء۔ ص ۵ ۱۱ ایضاً۔ ص ۶

جب سید صاحب کے والد صاحب آمادہ ہو گئے تو ۱۹۰۸ء میں سید صاحب ندوہ میں علم الکلام اور جدید عربی کے استاد مقرر ہوئے۔ ۱۹۱۰ء میں علامہ شبلی نے سیرۃ النبیؐ کی ترتیب و تدوین کا شعبہ قائم کیا تو سید صاحب اس کے لٹریری اسسٹنٹ ہوئے اور سیرت کی ترتیب و تدوین میں جس جگر کاوی، جان فشانی اور دماغ سوزی کا علامہ شبلی کی راہ نمائی میں مظاہرہ کیا اس کی سند استاد نے بسترِ مرگ سے اس طرح دی کہ سیرت کا کام جاری رکھنے کی نہ صرف وصیت کی بلکہ اتنے بڑے ندوۃ العلما سے صرف سید صاحب کو منتخب کیا۔

اس وقت سے ۱۹۱۱ء تک الندوہ کے ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کیا۔ ۱۹۱۲ء میں مولانا ابوالکلام آزاد کے مشہور اخبار الہلال کے ایڈیٹوریل اسٹاف میں شامل ہوئے۔ جنوری ۱۹۱۴ میں دکن کالج پونہ میں عربی و فارسی کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئے۔ نومبر ۱۹۱۴ میں علامہ شبلی کی وفات پر کالج سے قطع تعلق کر کے دارالمصنفین اعظم گڑھ کی بنیاد ڈالی اور بائیس سال دارالمصنفین کی خدمت کی۔ سید صاحب نے دارالمصنفین کا ترجمان ۱۹۱۶ء میں معارف جاری کیا اور چالیس سال ندوہ کے معتمد اعزازی رہے۔

یکم فروری ۱۹۲۰ء سے اواخر ستمبر ۱۹۲۰ تک علمائے ہند کے نمائندے کی حیثیت سے یورپ میں وفدِ خلافت کے رکن کے طور پر مقیم رہے۔ وفد نے انگلینڈ، سوئٹزرلینڈ، فرانس، اٹلی اور تقریباً تمام اہم اتحادی ممالک کے دورے کیے، اتحادی ملکوں کی رائے عامہ کو مسلمانوں کے حق میں ہموار کیا اور اپنے مطالبات حکومت برطانیہ اور دیگر اتحادی وزرا کو پیش کیے۔ سید صاحب برید فرنگ میں اپنے بارے میں لکھتے ہیں کہ "میرے متعلق ان مطالبات کے مذہبی نقطۂ نظر کی وضاحت تھی۔ میرے ذمے یہ کام تھا کہ مذہبی اور تاریخی حیثیت سے انگریزی اخباروں میں ہمارے خلاف جو مضامین نکلیں ان کا جواب لکھنا اور اسلامی ملکوں کے مسلمانوں سے مل کر ان کو تحریک سے آگاہ کرنا اور ان کی ہمدردی حاصل کرنا۔ ان کے علاوہ دو اور کام بھی میں نے اپنے ذمے لے رکھے تھے۔ ایک یہ کہ روزانہ انگریزی اخباروں کو پڑھ کر قابلِ لحاظ مضامین پر سرخ نشان لگا دینا کہ وفد کے دیگر ارکان بھی پڑھ لیں۔ دوسرے یہ کہ ہفتہ ہفتہ بھر کی رفتارِ کار اور کاموں کی روئداد لکھ کر ہندوستان بھیجنا خصوصیت کے ساتھ شوکت علی صاحب اور مولانا عبدالباری صاحب کو وفد کے کاموں سے باخبر رکھنا" یہ دورہ اس درجہ دوررس سیاسی فوائد کا حامل قرار دیا گیا کہ عظیم سیاست دان راجندر پرشاد (جو بعد میں

پہلے صدر جمہوریہ ہند بنے) نیز ڈاکٹر اقبال نے اس کا اعتراف کیا۔

۱۹۲۴ میں شریفِ مکہ اور سلطان ابنِ سعود میں تصادم ہوا۔ مسلمانانِ ہند نے مجلسِ خلافت کی تجویز پیش کی اور سید صاحب کی قیادت میں ایک وفد حجاز بھیجا۔ وہ دو ماہ جدہ رہا۔ سید صاحب نے اپنی تحریروں اور تقریروں سے رائے عامہ کو ہموار کیا۔ علما اور اکابر سے خط و کتابت اور ملاقاتیں کیں، شیخ ازہر سے گفتگو کی اور انھیں اپنا ہم نوا بنا لیا۔ یہ وفد کی بڑی کامیابی تھی اور عالمی اخبارات اور جرائد نے اس کامیابی کو شہ سرخیوں سے شائع کیا۔

۱۹۲۶ء میں ابن سعود نے ایک مؤتمر عالم اسلامی مکہ معظمہ میں طلب کی، جس میں ٹرکی، مصر، افغانستان، یمن اور دوسرے اسلامی ممالک کے مندوب شریک تھے۔ مسلمانانِ ہند نے سید صاحب کی سربراہی میں ایک وفد بھیجا، جس کے ارکان محمد علی، شوکت علی اور شعیب قریشی تھے۔ عالم اسلام کے نمائندوں نے سید صاحب کو نائب صدر بنایا اور صدر کی عدم موجودگی میں سید صاحب نے صدارت کی۔ یہ اعزاز آج تک کسی ہندی کو نہیں ملا۔

۱۹۳۰ء میں نادر شاہ امیر افغانستان نے سر راس مسعود، ڈاکٹر اقبال اور سید صاحب کو کابل یونیورسٹی میں عربی اور مذہبی تعلیم کے نصاب میں اصلاح اور تراجم و تالیف کا دائرہ وسیع کرنے کا طریق کار منضبط کرنے کے لیے مدعو کیا۔ ۱۹۳۳ء سے ۱۹۴۷ء تک چودہ سال مسلسل مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کورٹ کے ممبر رہے۔ نومبر ۱۹۴۰ میں علی گڑھ یونیورسٹی نے انھیں ایل ایل ڈی (ڈاکٹر آف لٹریچر) کی ڈگری دی۔ اپریل ۱۹۴۲ میں مولانا اشرف علی تھانوی صاحب سے بیعت ہوئے اور جلد ہی خرقۂ خلافت سے سرفراز ہو گئے۔ اس طرح سید صاحب کے والد بزرگوار کی وہ خواہش بھی پوری ہو گئی جس کی بنا پر وہ علمی سرگرمیوں سے مانع ہو رہے تھے۔ یوں خاندانی سررشتۂ تصوف بھی منقطع نہ ہوا۔ جون ۱۹۴۶ سے ۱۹۴۹ تک ریاست بھوپال کے قاضی القضاۃ کے عہدے پر فائز رہے۔ اس کے ساتھ ہی دار العلوم احمدیہ بھوپال کے صدر بھی رہے۔

جون ۱۹۵۰ میں وزیر اعظم پاکستان شہید ملت لیاقت علی خان کی دعوت پر ہندوستان سے ترکِ سکونت کر کے پاکستان تشریف لے گئے۔ اس ترکِ سکونت، سفر اور نقل مکانی کا مقصد خالصتاً ہجرت اور اس اسلامی مملکت میں فکری انقلاب، مذہبی اصلاحات میں حکومت کی راہ نمائی

اور دینی اور دنیاوی تعلیم میں انقلاب برپا کرنے کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ مولانا سید صباح الدین عبدالرحمٰن لکھتے ہیں :

تقسیم ہند کے بعد پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ اسلامیات کی صدر نشینی جس کی تنخواہ ڈیڑھ ہزار روپے ماہوار تھی پیش ہوئی، اس کو بھی قبول نہ کیا۔ ... ایک بار مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ دینیات کی پروفیسری قبول کرنے کے لیے اصرار کیا گیا تو فرمایا کہ پھر دارالمصنفین کو کیا کروں گا۔ بعض ذمہ دار اشخاص نے تجویز کیا کہ یہ ادارہ بھی وہاں منتقل کر دیا جائے تو سید صاحب نے جواب دیا پھر استاد مرحوم کا مزار کس کے حوالے کروں گا (معارف ص ۷۵)

لیکن جب ہجرت اور پاکستان میں اسلامی دستور بنانے میں حکومت کی راہ نمائی کا معاملہ درپیش ہوا تو یہ موانع سدراہ نہ ہو سکے۔ کوئی مالی منفعت بھی حاصل نہیں کی۔ حتیٰ کہ باوجود اصرار کے اپنی متروکہ املاک کا معاوضہ بھی قبول نہ کیا۔

سید صاحب پاکستان تشریف لائے تو انھیں جمعیۃ العلمائے پاکستان کا صدر بنایا گیا۔ ان کا قابلِ قدر کارنامہ اکتیس[۳۱] علما سے جو مختلف مکاتبِ فکر سے تعلق رکھتے تھے، مثلاً بریلوی، اہلِ حدیث، دیوبندی، شیعہ وغیرہ کے اجتماع منعقدہ کراچی میں تین دن کی مسلسل بحث وتمحیص اور افہام وتفہیم کے بعد ایک متفقہ دستوری خاکہ تیار کرا لینا، اس پر دستخط لینا اور اسے حکومت کو پیش کرنا تھا۔

سید صاحب کا ایک کارنامہ مختلف اسلامی ممالک کے درمیان ربط وضبط اور اتحاد کی فضا قائم کرنا تھا۔ چناں چہ ۱۹۵۲ میں انھوں نے اسلامی ممالک کے مشاہیر علما، فضلا، زعما اور مفکرین کا ایک جلسہ کراچی میں منعقد کیا۔ جو تین دن (۱۴، ۱۵ اور ۱۶ فروری) تک جاری رہا۔ اس میں مفتیِ اعظم فلسطین، عراق وایران اور دیگر اسلامی ملکوں کے علما وفضلا نے شرکت کی۔ پہلے دن جلسے کی صدارت سید صاحب نے اور دوسرے دن مفتیِ اعظم فلسطین نے کی۔

۱۹۵۰ء کے اواخر میں لیاقت علی خان مرحوم نے لا کمیشن کے قیام کا اعلان کیا، اس کے تین ارکان جسٹس عبدالرشید، جسٹس معین اور سید صاحب مقرر ہوئے۔ اس کمیشن کا کام پاکستان کے دستور کو اسلامی خطوط پر استوار کرنے کے بارے میں سفارشات پیش کرنا تھا۔

مارچ ۱۹۵۳ میں آخری بار ہندوستان گئے۔ اسی ماہ ڈھاکہ میں ہسٹری کانفرنس کی صدارت کی۔ خطبۂ صدارت میں بنگالی مسلمانوں کو یاد دلایا کہ ہندو فرنگی گٹھ جوڑ نے بنگالی مسلمانوں کو اسلامی ثقافت اور تہذیب سے دُور کرنے کی گھناؤنی سازش کے تحت بنگالی کو فارسی رسم الخط سے بدل کر دیوناگری، ہندی اور سنسکرت رسم الخط میں لکھنے کی بنا ڈالی اور مسلمانوں کو اپنی سابقہ روش سے رجوع کر لینا چاہیے لیکن بنگالیوں نے اس پر جس ردِ عمل کا مظاہرہ کیا وہ نہایت افسوس ناک تھا۔ جناب پروفیسر رشید احمد صدیقی صاحب اس ذیل میں فرماتے ہیں "لیکن یہ بات دل میں بار بار آتی رہی کہ سید صاحب مستقل علی گڑھ آ گئے ہوتے تو بحیثیت مجموعی اس سے بہتر ہوتا جو بعد میں پیش آیا"[۱۲] یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ سید صاحب کو ہجرت سے قبل قیامِ علی گڑھ کی پیش کش ہو چکی تھی۔ ہمارے خیال میں مسئلے کا جائزہ سید صاحب کی افتادِ طبع کو پیشِ نظر رکھ کر نا چاہیے۔ ہم اس سلسلے میں سید ابو عاصم صاحب ایڈووکیٹ کے مقالے "علالت سے وفات تک" سے ایک اقتباس پیش کرتے ہیں۔

"یوں تو وہ دو مرتبہ حرمین شریفین کی زیارت کر چکے تھے لیکن ان کے دل میں یہ بات کھٹکتی تھی کہ دونوں سفر سیاسی تھے۔ اس سے پہلے ۱۹۲۴ء اور ۱۹۲۶ء میں وفد حجاز میں ہندی مسلمانوں کے نمائندے بن کر تشریف لے گئے تھے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ وہ بھی رضائے الٰہی کے لیے نہ تھے۔ لیکن اللہ کے بندے اور عاشقِ رسولؐ نے ان کے دربار میں صرف انہی کا نام لے کر حاضری مناسب سمجھی۔ چنانچہ ۱۹۴۹ء میں بیت اللہ کو تشریف لے گئے"[۱۳]

مذکورہ بالا اقتباس ہی ان کی افتادِ طبع کو ظاہر کرنے کے لیے کافی ہے، ہم ایک واقعہ کی جانب اور اشارہ کریں گے۔ اس میں سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب کے مقالے "اخلاق و سیرت کے کچھ جلوے" سے حسبِ ذیل اقتباس ملاحظہ کیجیے

"پاکستان ہجرت کی تو آبائی مکانات، شاندار بنگلہ، باغ، جائداد، گھر کا سامان، حضور نظام کا وظیفہ اور بھوپال کی پراویڈنٹ فنڈ کی رقم سب سے منہ موڑ لیا اور مہاجرت کی صعوبتوں کو برداشت کرتے رہے۔ جولائی ۱۹۵۱ء میں راقم کو لکھا کہ مہاجرت کی شان بہت بلند ہے۔ مہاجر صحابہ کی قدر اب معلوم ہوئی ہے۔ نہرو لیاقت پیکٹ سے بہار کے مہاجروں کو بہت کچھ سہولتیں دی گئیں، ان سے فائدہ اٹھانے کے لیے بار بار ان کی خدمت میں گزارش کی گئی۔

۱۲؎ رشید احمد صدیقی، گنج ہائے گراں مایہ۔ معارف مئی ۱۹۵۵ اعظم گڑھ ص ۳۲۱

۱۳؎ سید ابو عاصم ایڈووکیٹ، کراچی، علالت سے وفات تک۔ معارف اعظم گڑھ مئی ۱۹۵۵ء، ص ۳۶۴

لیکن غایت استغنا میں ۱۸ اگست کو تحریر فرمایا: " ہندوستان چھوٹنے پر جائداد اور مکان کی محبت دل سے نکل گئی اور بقول شاعر :

بلبل نے آشیانہ چمن سے اٹھا لیا — اس کی بلا سے بوم رہے یا ہما رہے

سلوک کی وہ منزل جو تصوف کی راہ سے برسوں میں طے ہوگی اس مہاجرت سے دم کے دم میں طے ہوگئی۔" [۱۴]

۱۹۲۰ء میں یورپ کے سفر کے دوران قولنج اور درد گردہ میں مبتلا ہوئے۔ انگریز ڈاکٹروں کی تجویز تھی کہ آپریشن کیا جائے۔ جیسا برید فرنگ میں مطبوعہ کئی خطوط سے ظاہر ہوتا ہے۔ فرانسیسی ڈاکٹروں نے فرنگی ڈاکٹروں کو قصائی قرار دیا اور آپریشن کی مخالفت کی۔ سفرِ حجاز میں مختلف امراض و عوارض میں مبتلا ہوئے۔ ۱۹۳۵ء میں ذات الجنب کا حملہ ہوا، افاقہ ہوا۔ لیکن کثرتِ کار، مسلسل بے آرامی، پیہم سفر اور ہر سفر کے بعد بیمار ہونے کا معمول، غرضیکہ ان باتوں نے کمزور کر دیا تھا، اور چند دن صاحب فراش رہ کر بحساب شمسی ۶۹ سال اور بحساب قمری ۷۱ سال کی عمر میں ۱۴ ربیع الاوّل ۱۳۷۳ مطابق ۲۲ نومبر ۱۹۵۳ کراچی میں انتقال کیا، اور اسلامیہ کالج کراچی میں مولانا شبیر احمد عثمانی کے پہلو میں مدفون ہوئے۔

پہلی شادی ۱۹۰۴ء میں اپنے چچا ابو یوسف صاحب کی لڑکی سے ہوئی، ان سے دو بچے ہوئے۔ (۱) سیدہ مرحومہ (۲) ابوسہیل۔ دوسری شادی ۱۹۲۰ء میں ہوئی، اس سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ تیسری شادی ۱۹۳۲ء میں ہوئی، اس سے چار لڑکیاں اور ایک لڑکا سلمان ہوئے۔

اب ان کی تصنیفات پر نظر ڈالیے جس سے ان کے فضل و کمال کا پتا چلتا ہے۔

(۱) دروس الادب دو جلدیں ۱۹۰۸ء
(۲) لغات جدیدہ ۱۹۱۰ء
(۳) ارض القرآن جلد اوّل ۱۹۱۵ء
(۴) رسالہ اہل سنت والجماعت ۱۹۱۷ء
(۵) حیاتِ مالک ۱۹۱۷ء
(۶) سیرالنبیؐ جلد اوّل [۱۵] ۱۹۱۸ء

---

[۱۴] سید صباح الدین عبدالرحمٰن : اخلاق و سیرت کے کچھ جلوے۔ معارف اعظم گڑھ۔ مئی ۱۹۵۵ - ص ۶۷

[۱۵] سیرت النبی کی پہلی جلد تو بکمال و تمام علامہ شبلی نعمانی نے لکھی اور شبلی کے انتقال کے وقت طباعت کے لیے تیار تھی۔ دوسری جلد بھی گو شبلی ہی نے لکھی ہے۔ لیکن کے آخری مراحل میں تھی۔ چنانچہ اس کے سرورق پر (از شبلی نعمانی تکملہ و اضافہ علامہ ندوی) لکھا ہے۔ تیسری جلد کا کچھ حصہ مولانا عبدالباری ندوی نے لکھا ہے۔ اور آخری یعنی جلد ہفتم کے چند ابواب ہی علامہ سلیمان ندوی لکھ چکے تھے کہ خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

(۷) ارض القرآن جلد دوم ۱۹۱۸ء

(۸) سیرۃ النبیؐ جلد دوم ۱۹۲۰ء

(۹) سیرۃ عائشہؓ ۱۹۲۰ء

(۱۰) خلافتِ عثمانیہ اور دنیائے اسلام ۱۹۲۱ء

(۱۱) خلافت اور ہندوستان ۱۹۲۱ء

(۱۲) سیرۃ النبی جلد سوم ۱۹۲۴ء

(۱۳) " " جلد چہارم ۱۹۲۸ء

(۱۴) عرب و ہند کے تعلقات ۱۹۲۹ء

(۱۵) خیام ۱۹۳۰ء

(۱۶) رسولِ رحمت ۱۹۳۲ء

(۱۷) سیرۃ النبی جلد پنجم ۱۹۳۵ء

(۱۸) عربوں کی جہازرانی ۱۹۳۵ء

(۱۹) خطباتِ مدراس ۱۹۳۹ء

(۲۰) سیرۃ النبی جلد ششم ۱۹۳۹ء

(۲۱) نقوشِ سلیمانی ۱۹۳۹ء

(۲۲) رحمتِ عالم ۱۹۴۰ء

(۲۳) حیاتِ شبلی ۱۹۴۱ء

(۲۴) خواتینِ اسلام کی بہادری ۱۹۴۵ء

(۲۵) سیر افغانستان ۱۹۴۹ء

(۲۶) انتخاباتِ شبلی ۱۹۵۰ء

(۲۷) برید فرنگ ۱۹۵۳ء

(۲۸) ہندوؤں کی تعلیم مسلمانوں کے عہد میں ۱۹۵۴ء

(۲۹) یادِ رفتگان ۱۹۵۵ء

(۳۰) مقالاتِ سلیمان جلد اوّل ۱۹۶۶ء

(۳۱) " " جلد دوم ۱۹۶۸ء

(۳۲) سیرۃ النبی جلد ہفتم ۱۹۸۲ء

(۳۳) شبلی کے مضامین اور مکتوبات گیارہ جلد

(۳۴) ارمغانِ سلیمان - مرتبہ غلام محمد صاحب